مولانا محمد حنیف ندوی

# منطقِ استقرائی اور قرآن

(یہ مقالہ قرآن کانفرنس منعقدہ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۳ء لاہور میں پڑھا گیا)

## تعریف:

منطق ایسے فن سے تعبیر ہے جو فکر و استدلال کے ان پیمانوں اور جدولوں کی تعیین کرتا ہے، جن کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ دلائل و مقدمات میں کہاں جھول ہے، کہاں مغالطہ کی کارفرمائیاں ہیں اور کہاں اشہبِ استنباط نے اخذِ نتائج میں ٹھوکر کھائی ہے۔

قدیم زمانہ سے اس کی تقسیم دو خانوں میں سمٹی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ ایک خانہ استخراج کا ہے اور ایک استقراء کا۔ اگر آپ کلیات کی روشنی میں جزئیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو منطقِ استخراجی سے کام لینا پڑے گا۔ اور اگر جزئیات کے استیعابِ ممکنہ سے آپ کسی کلیہ یا حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے خواہاں ہیں تو اخذِ نتائج کے اس اسلوب کو استقراء کہیں گے۔ یعنی اگر آپ سقراط کو اس بنا پر فانی ٹھہراتے ہیں کہ سقراط چونکہ انسان ہے اور ہر انسان فانی ہے، اس لیے سقراط کو بھی فانی ہونا چاہیے تو یہ وہ طریقِ استدلال ہے جو منطقِ استخراجی کے نام سے موسوم ہے۔ اور اگر سقراط اس وجہ سے فانی ہے کہ آپ کے مشاہدہ نے جتنے بھی افرادِ انسانی کو دیکھا، ان سب کو بالآخر فنا کے گھاٹ اترتے دیکھا، اس لیے ضرور ہے کہ سقراط بھی موت اور فنا سے دوچار ہے، تو جزئیات کا اس طور سے مشاہدہ و استدلال منطقِ استقرائی کی ترجمانی کرے گا۔

استدلال کی ان دونوں صورتوں میں اگرچہ نتیجہ ایک ہی برآمد ہوتا ہے، تاہم استدلال کا منہاج دونوں میں مختلف ہے۔ اول الذکر صورت میں آپ نے روشنی ایک کلیہ۔ دعویٰ اور تعریف سے حاصل کی۔ اور ثانی الذکر صورت میں یہ روشنی براہِ راست جزئیات کے مطالعہ و مشاہدہ سے حاصل ہوئی۔ منہاج کے اختلاف کے علاوہ دونوں کی تگ و تاز کے میدان بھی مختلف ہیں۔ منطقِ استخراجی کا

استعمال مابعد الطبیعی مسائل میں۔ تعریف، حدود اور مقدمات کی ان صورتوں میں ہوتا ہے، جہاں بحث کی نوعیت یہ ہو کہ قضایا کی ترتیب میں کہیں سقم تو نہیں رہ گیا۔ یا اخذ نتائج میں کہیں لغزش تو پائی نہیں جاتی ۔ اس کے برعکس طبیعی حقائق کے مطالعہ، چھان بین اور تحقیق میں یہ منطق کام نہیں دیتی ۔ اس میدان میں استقرا ہی خم ٹھونک کر فکر و نظر کے سامنے آ پاتی ہے ۔

منطق استخراجی کی اسی واماندگی نے عہد جدید کے فکر و دانش کے حلقوں کو مجبور کیا کہ استدلال کے اس فرسودہ طریق سے ہاتھ اٹھائیں اور استقرا و استیعاب ممکنہ کے اس اسلوب کو آزمائیں جس کو مفید ظن کہہ کر ترک کر دیا گیا تھا تاکہ انسان کائنات کے بارے میں نئے حقائق سے آشنا ہو سکے ۔

## دونوں میں تقابل کی نوعیت

منطقِ استخراجی نے اگر استدلال کی زلف دوتا کو سنوارا، مغالطات کی نشان دہی کی اور انسانی ذہن کی تشحیذ کا فرض انجام دیا، تو منطقِ استقرائی نے اسرار کائنات کی گرہیں کھولیں، ایجادات کی راہیں ہموار کیں اور انسان کو چاند پہ پہنچا دیا جو لاکھوں اور کروڑوں برس سے زمان و مکان کا زندانی چلا آ رہا تھا۔

ہمارے مقالے کا موضوع یہی منطقِ استقرائی ہے جس نے انسان کی عظمتِ فکری کو چار چاند لگا دیے اور بشر خاکی کو یہ حوصلہ بخشا کہ فطرت کے رازہائے دردن پردہ کو بے نقاب کر سکے۔ ہم اس مقالے میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جہاں تک استقرا کی روح، غنا اور اسلوب کا تعلق ہے، بیکن اور مِل سے بہت پہلے قرآن حکیم نے اس کی نشاندہی فرمائی اور منجملہ عظیم خوارق کے اس کا ایک خارقہ یہ بھی ہے ۔ خود ستائی اور خطابت آرائی سے قطع نظر اس بہت بڑے دعوے کے اثبات کے سلسلہ میں ہمیں غور و فکر کے ان مرحلوں سے گزرنا ہوگا جن کو خود استقرا اخذ نتائج کے لیے ضروری ٹھہراتی ہے ۔

## چار بنیادی سوال

اس بحث کا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا قرآن حکیم کائنات کی معروضیت کو تسلیم کرتا ہے ۔ کیا قرآن کے نقطۂ نظر سے اس کائنات میں نظم و ضبط کے قاعدے جاری و ساری ہیں جو ہمارے گرد و پیش پھیلی

ہوئی ہے اور کیا قرآن فکر و استدلال کی عصمت و صحت کو برقرار رکھنے کے لیے واضح ہدایات دیتا ہے۔ ذہن کو چمکاتا اور سنوارتا ہے اور عقیدہ و اذعان پر بھروسہ کرنے کے بجائے دلیل اور فکر و تدبر پر زور دیتا ہے۔ اور بدرجۂ آخر دریافت طلب یہ نکتہ رہ جاتا ہے کہ آیا قرآن فکر و تدبر کے رخوں کو جزئیات کی طرف موڑ دینے کی حمایت کرتا ہے۔ اور تاکید کرتا ہے کہ ہم فطرت کی کرشمہ طرازیوں کو سمجھنے کی سعی بلیغ کریں۔

ان سوالات کا مثبت اور متعین جواب دیے بغیر یہ دعویٰ ہرگز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا کہ قرآن کی فیض رسانیوں نے اوّل اوّل استقراء کی اہمیتوں کو نکھارا اور متعین کیا۔ آئیے! علی الترتیب ان سوالات پر تحقیقی انداز سے غور کریں۔

## کیا یہ عالم معروضیت لیے ہوتے ہے؟

پہلے معروضیتِ عالم کے مسئلہ کو لیجیے، اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام سے پہلے کے مذاہب اور فلسفیانہ افکار کا جائزہ لیں جو اس عالم کے بارے میں اختیار کیے گئے اور یہ دیکھیں کہ ان سے انسانی زندگی پر کیا اثر پڑا۔

بات یہ ہے کہ فلسفہ اور مذہب نے اسلام سے متعلق دو واضح اور متعین موقف اختیار کیے۔ افلاطون نے حقانیتِ عالم کا انکار کیا اور یہ کہا کہ اس عالم کی تمام ترنیرنگیاں حقیقت کا پرتو، انعکاس اور ظلّ ہیں۔ عیسائیت کے روایتی رجحان نے اس موقف کی تائید کی اور زندگی کے نقشہ کو اس انداز سے ترتیب دیا جس سے زندگی سے بیزاری نفرت اور تحقیر کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ ارسطو نے نہ صرف وجودِ عالم کو تسلیم کیا بلکہ وجودِ عالم کم و کیف اور زمان و مکاں کے جن رشتوں سے منسلک ہے ان کی بھی وضاحت کی جو رشتے منطق کی اصطلاح میں "مقولات عشر" کے نام سے موسوم ہوئے۔

اسلام نے کھلے بندوں اس موقف کی تائید کی کہ یہ عالم رنگ و بُو، یہ کائنات بوقلموں اور یہ کارخانہ علم و ہنر، موجود و برحق ہے اور اس کا وجود و تحقق کسی سیمیائی طلسم یا فکر و تصور کی عکس آرائی کے برخلاف خود حضرتِ حق کے وجود و اثبات پر ایک روشن دلیل اور واضح نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا وجود باجود تحقق و اثبات کے قدوہ عالیہ پر فائز ہے تو کوئی وجہ

نہیں کہ اس کی تخلیق و آفرینش کا اعجاز محض خیال، تصور اور فکر و نظر ہی کا کرشمہ ہو۔ اور وجودِ حقیقی سے محروم ہو۔ یہاں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس عالم کے بارے میں عقیدہ و موقف کا یہ اختلاف صرف نظری و عقلی نوعیت ہی کا نہیں بلکہ یہ اختلاف عمل و کردار کا اختلاف ہے اور اس کو اپنانے اور ماننے سے دو بالکل مختلف قسم کے نتائج مترتب ہوتے ہیں۔

اگر یہ دنیا باطل ہے، اگر یہ کارخانۂ عالم محض فکر و تصور کی تجسیم اور انعکاس ہے اور اس کا اپنا کوئی وجود نہیں تو پھر یہ راہ دنیا سے نفرت و بیزاری کی راہ ہے اور علوم و فنون، اور زندگی ہیں تگ و تاز سے انحراف کی راہ ہے۔ یہی نہیں، یہ راہ جہل و نادانی اور تعصبات کی راہ ہے۔ مزید برآں یہ راہ غیر اجتماعی اور غیر تمدنی ٹھہرے گی۔ اور آخر میں انسانی شرف و مجد کا گلا گھونٹ دینے والی راہ ثابت ہو گی۔ اور اگر یہ دنیا موجود اور تحقق پذیر ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے مثبت تقاضے ہیں، جنھیں بہرحال پورا کرنا ہے۔ دنیا کے بارے میں اس موقف کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے زندگی کی نشاط آفرینیوں میں بھرپور حصہ لینے کا عہد کیا ہے۔ ہم نے اس کو سنوارنے اور بنانے کی ذمہ داریاں قبول کر لی ہیں، اور ہم نے طے کر لیا ہے کہ علوم و فنون کے قافلوں کو آگے بڑھائیں گے۔ تہذیب و تمدن کی گرہیں سلجھائیں گے اور انسان کے داعیہ تخلیق و ایجاد کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

ظاہر ہے موقف اور نقطۂ نگاہ کا یہ اختلاف زندگی کے جن دو رخوں اور دھاروں کو فکر و نظر کے سامنے لاتا ہے، وہ محض فرضی اور خیال و وہم کی طرفہ طرازیوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس حقیقت کا غماز ہے جس کو رہبانیت اور اسلام کی تاریخ میں واضح طور سے دیکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ یعنی جہاں عیسائیت نے دنیا سے گریز و فرار کی راہ اختیار کی۔ علم و تہذیب کے قافلوں کو آگے بڑھنے سے روکا۔ انسانیت کی تذلیل کی۔ حقائق کے مقابلہ میں شدید قسم کے تعصبات کا مظاہرہ کیا وہاں اسلام کا کردار ایسے تصورات و عقائد کا حامل ثابت ہوا، جس سے علم و عرفان کی شمعیں فروزاں ہوئیں۔ بزم کون تہذیب و تمدن کی گلکاریوں سے آراستہ ہوئی اور طلب و جستجو، اور تحقیق و کاوش کے داعیوں نے نہایت سلیقے سے علوم و فنون کے دبستان سجائے۔

اس عالم سے متعلق اسلام کے زاویۂ فکر کی بات چھڑی ہے تو اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے

کہ قرآن اس سلسلہ میں ان تین نکات کی وضاحت کرتا ہے :

۱- یہ کہ یہ عالم تحقق و ثبوت کے لوازم سے پوری طرح اتصاف پذیر ہے ۔

۲- یہ کہ اس کی تخلیق و آفرینش مقصدیت لیے ہوئے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اندھی اور غیر منطقی قوتوں نے جنم نہیں دیا بلکہ علیم و خبیر خدا نے پیرہنِ وجود بخشا ہے ۔

۳- اور یہ کہ یہ دنیا منزل نہیں، منزل آخرت ہے ۔ اس لیے زندگی کے نقشہ کو ترتیب دیتے وقت دیکھنا یہ ہوگا کہ یہ آخرت کے تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو ۔

یہ عالم برحق اور موجود ہے ۔ اس کے ثبوت کے لیے دیکھیے سورۂ زمر، سورۂ جاثیہ، اور سورہ احقاف کی یہ آیتیں :

۱- خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔ (۵)

اسی نے زمین و آسمان کو ٹھیک ٹھیک اور تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ۔

۲- وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔ (۲۲)

اور اللہ نے زمین اور آسمانوں کو ٹھیک ٹھیک اور تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ۔

۳- مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (۱۷)

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان واقع ہے ۔ برحق اور حکمت پر مبنی پیدا کیا ہے ۔

## یہ عالم معروضیت کے ساتھ ایک نوع کے تقدس کا بھی حامل ہے ۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ قرآن حکیم نے کائنات کے بارے میں "حق" کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے، یہ صرف وجود تحقق ہی پر دلالت کناں نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ عالم ایک طرح کی حرمت و تقدیس سے بھی بہرہ مند ہے ۔ شرط یہ ہے کہ انسان یہاں رہ کر اس احساس کی پرورش کرے کہ یہ عالم اپنی زیبائی و رعنائی کے باوصف عارضی و فانی ہے اور مجھے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا ہے بلکہ چند سے قیام کر کے آگے بڑھنا اور رب ذوالجلال کے حضور پیش ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے ۔

یہ کائنات اپنی آغوش وجود میں، غرض و مقصد لیے ہوتے ہے ۔ قرآن حکیم نے اس مضمون کو کئی انداز سے پیش کیا ہے ۔ سورۂ ص میں ہے :

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا۔ (۲۷)

اور ہم نے زمین، آسمان اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، اس کو بے کار اور حکمت سے تہی پیدا نہیں کیا۔

سورۂ آل عمران میں ہے :

ربنا ما خلقت ھذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النار۔ (۱۹۱)

اور کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار تو نے اس دنیا کو بیکار اور حکمت سے تہی پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے۔ سو ہمیں عذاب جہنم سے محفوظ رکھ۔

رہا تیسرا نکتہ تو اس کی تشریح کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان بالآخرت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ زندگی، زندگی کی یہ تگ و دَو، اور جسم و روح کی تکمیل و اتمام کی یہ آرزو۔ جو دنیوی زندگی میں انسان کو سرگرم عمل رکھتی ہے، موت کے حادثے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ زندگی کا یہ سفر برابر جاری رہتا ہے اور ایسی زندگی پر جا کر منتج ہوتا ہے۔ جو ابدی ہے اور جس کا رخ ادنی خواہشات کے بجائے اللہ تعالی کی صفات کمال کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اس عالم ابدی کے کوائف اور لذتوں کا کیا حال ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں اس کی جھلک سورۂ سجدہ میں کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے :

فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین۔ (۱۷)

کوئی متنفس نہیں جانتا کہ اس کے لیے کیا کیا سامانِ راحت چھپا کر رکھا گیا ہے جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ہے :

وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان لو کانوا یعلمون۔ (۶۴)

اور زندگی کا گھر تو آخرت کا گھر ہے کاش یہ سمجھتے۔

معروضیت عالم کی بحث غیر مفید اور نا تمام رہے گی، اگر اس میں تعلیل و تسبب کی کارفرمائیاں نہ پائی جائیں نظم و قاعدہ کی باقاعدگی مفقود ہو اور مقصود و وسائل میں رشتہ و تعلق کی نوعیت معدوم ہو۔ اور اگر اس کارگاہ حیات میں ایک اسلوب خاص پایا جاتا ہے اور ذرہ ذرہ سے حکمت و دانائی کی معجزہ طرازیاں جھلک رہی ہیں تو اس کا صاف صاف مطلب ہے کہ یہ عالم استقرا و جستجو اور طلب و تفحص کا بجا طور سے سزاوار اور ہدف ہے۔ سائنس اور طبیعیات کے اس جانے بوجھے اصول کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے

سورۂ جاثیہ میں ہے :

ان فی السّمٰوٰت والارض لاٰیات للمؤمنین ۔ (۳)

یقیناً زمین اور آسمانوں میں مومنوں کے لیے نشانیاں ہیں ۔

سورۂ ذاریات میں ہے :

و فی الارض اٰیات للموقنین ۔ (۲۰)

اور زمین میں یقین سے بہرہ مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں ۔

سورۂ یونس میں ہے :

ان فی اختلاف الیل والنہار وما خلق اللہ ۔ فی السّمٰوٰت والارض لاٰیات لقوم یتقون ۔ (۶)

رات اور دن کے آنے جانے میں ، اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ۔ پاک بازوں کے لیے نشانیاں ہیں کہ اس کارگاہِ حیات میں علل و اسباب کا عمل جاری ہے ۔

---

اس عالم کی معروضیت تسلیم کر لینے کے بعد اور اس حقیقت کو مان لینے کے بعد استقرا کی طرف دوسرا قدم یوں اٹھتا ہے کہ ہم تفکر و تعقل کی اہمیتوں پر ایمان لائیں اور خرد و دانش کے دھاروں کے آگے تعصبات کے بند باندھنا چھوڑ دیں اور جہل و نادانی کی ان دیواروں کو گرا دیں جن کو بیکن اصنام سے تعبیر کرتا ہے ۔ یہی نہیں ۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ عقل و خرد کی نشاط آفرینیوں کو اس اہم کام کے لیے وقف کر دیں کہ ہم جزئیات عالم پر عبرت و استدلال کی نظر ڈالیں ۔ اور ان میں ان رشتوں ، اصولوں اور پیمانوں کو ڈھونڈ نکالیں ، جن سے تخلیق و ارتقا کا پیچیدہ سلسلہ نکھرتا اور حل ہوتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ عالم آرائی بخت و اتفاق کی بے غرض کارسازیوں سے ظہور میں نہیں آئی بلکہ اس کے پیچھے باقاعدہ عقل و حکمت اور ربوبیت کے کرشمے سرگرم عمل ہیں ۔

مختصر لفظوں میں ۔ یہ دعویٰ کہ قرآن نے اول اول استقرائی طرزِ فکر کی طرح ڈالی ہے ، ان تین نکات کے اثبات پر منحصر ہے :

۱۔ کیا قرآن فکر و تعقل کے داعیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

۲۔ کیا قرآن حکیم، فکر و دانش کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی دُور کر دینے کا حامی ہے۔

۳۔ اور یہ کہ کیا قرآن جزئیات عالم کو فکر و تعقل کا محور قرار دیتا ہے۔

## کیا قرآن فکر و تعقل کے تقاضوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؟

جہاں تک دعویٰ کے پہلے جزء کا تعلق ہے، ہم بغیر کسی مبالغہ آرائی کے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم وہ پہلی الہامی کتاب ہے جس نے خرد و عقل اور دین کے تقاضوں میں تضاد کی نفی کی۔ اور اس حقیقت کا اعلان کیا کہ دونوں کی منزل ایک ہے۔ اگر وحی و تنزیل کی ترجمانی صحیح ہو۔ اور عقل و فکر کا سانچہ درست ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی یافت اور اخذ کردہ نتائج میں کسی طرح کا اختلاف پایا جائے۔ سورۂ نجم میں ہے:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۴۲)

اور یہ کہ تمھیں گھوم پھر کر اپنے پروردگار ہی کے ہاں پہنچنا ہے۔

دین صحیح اور عقل صحیح کی منزل و ہدف ایک ہے۔ دونوں کا میدان، اسلوب اور پرواز کی جہتیں اگرچہ مختلف ہیں تاہم دونوں کی سوتیں چونکہ ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے پھوٹی ہیں اس لیے ضرور ہے کہ آخر آخر میں یہ انھی نتائج تک پہنچیں جن کو ہم دین اور دینی قدروں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان میں اختلاف کی وجہ یہ نہیں کہ دونوں میں تضاد رو نما ہے، بلکہ اختلاف اس لیے ابھرتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کی ترجمانی صحیح نہیں ہو پاتی۔

قرآن حکیم نے عقائد و عمل کے جس نقشہ کو پیش کیا اس کی معقولیت اس درجہ مسلم ہے کہ خود بعض مخالفین نے اس کو اس وجہ سے دین ماننے سے انکار کر دیا کہ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو ہم راز، سِتر اور معمہ کہہ سکیں۔ ان کے نزدیک دین میں ایسے گوشوں، عقیدوں اور عجائب و غرائب کا ہونا ضروری ہے جن کو عقل و خرد کے تقاضے ماننے سے انکار کر دیں۔ طرطلین ایک مشہور عیسائی متکلم کا کہنا ہے:

"میں کہتا ہوں، مسیح خدا کا بیٹا ہے اور مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں، میں مانتا ہوں کہ خدا پر موت طاری ہوئی اگرچہ یہ خلافِ عقل ہے۔ پھر یہ خدا جی اٹھا، یہ بھی خلافِ عقل ہے۔ اور میں

ان عقائد پر اسی وجہ سے عقیدہ رکھتا ہوں کہ عقل وخرد کی رُو سے یہ باطل ہیں۔"

قرآن حکیم نے مسلمانوں کو فکر و تدبر پر کس کس انداز اور اسلوب سے ابھارا ہے۔ قرآن حکیم کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا ہر ہر جملہ آیت کہلاتا ہی اس بنا پر ہے کہ اس میں دانش و عقل کی نشانیاں پنہاں ہیں۔ اس لیے ہم ان متعدد شواہد کو پیش نہیں کرتے جو قرآن حکیم کی سورتوں میں آیات کی شکل میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ اس سلسلہ کی دو آیتیں بہت اہم ہیں۔ ان میں ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شعور و احساس کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ ان سے صحیح صحیح کام لیا گیا یا نہیں، اور یہ کہ ان سے اعتبار اور استدلال کے موتی چنے گئے یا ان کو جہل و عناد کے دبیز پردوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ دوسری آیت اہل جہنم کے اس احساسِ پشیمانی کو ظاہر کرتی ہے کہ اے کاش ہم نے دنیا میں رہ کر سوچا سمجھا ہوتا اور فکر و تدبّر کی صلاحیتوں کو اچھی طرح آزمایا ہوتا۔ سورۂ اسراء میں ہے:

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولٰئِک کان عنہ مسئولا۔ (۳۶)

کان، آنکھ اور دل، ان سب سے بازپرس کی جائے گی۔

یہاں یہ نکتہ جاذبِ توجہ ہے کہ قرآن حکیم نے کان، آنکھ اور دل کے لیے اولٰئِک کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا اطلاق عموماً ذوی العقول پر ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن حکیم ان میں سے ہر ایک آلہ کو ایک شخص قرار دیتا ہے جو سوچتا اور جانتا بوجھتا ہے اور اس سے توقع رکھتا ہے کہ یہ اپنے فرائض کماحقہٗ ادا کرے گا اور جانچ پرکھ کی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا جو اس میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ سورۂ ملک میں ہے:

وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ۔ (۱۰)

اور کہیں گے، اگر ہم سنتے اور سوچتے سمجھتے ہوتے تو آج دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

## کیا قرآن فکر و تعقل کی تگ و تاز کو تعصبات سے پاک دیکھنا چاہتا ہے؟

آیئے! اب بحث کے اس نکتے کی طرف بڑھیں کہ آیا قرآن فکر و تعقل کی تگ و تاز کو گردوپیش کے تعصبات اور ماضی کے بندھنوں سے ہٹ کر آزادانہ اور اپنی اصلی اور فطری شکل و صورت میں جلوہ گر دیکھنے کا خواہاں ہے یا اس کی روش بھی بغیر سوچے سمجھے خیالات و عقائد کی تقلید

ہی پر مبنی ہے۔

اس نکتہ کے بارے میں بھی ہمیں تفصیل سے کچھ کہنا نہیں ہے۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ قرآن، فکر و تدبر اور تذکر و تعقل پر بار بار اُبھارتا اور آمادہ کرتا ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ قرآن کے نقطہ نظر سے عقل و دین میں کوئی منافات پائی نہیں جاتی، تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن فکر و تعقل کے تقاضوں کو تعصبات کی کسی بھی زنجیر میں پا بجولاں کر دینے کا حامی نہیں۔ اس ضمن میں صرف یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بیکن جن تعصبات کو 'اصنام' سے تعبیر کرتا ہے قرآن اس کو تقلید آبا کا نام دیتا ہے، اور دو اشگاف الفاظ میں کہتا ہے کہ یہ قطعی ضروری نہیں کہ حق ماضی ہی کی میراث ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حق پر ہونے کے بجائے ماضی میں لوگ جہل و نادانی کا شکار ہوں۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۤؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۔ (۱۷۰)

کیا لوگ اس حال میں بھی تقلید کو ترجیح دیں گے۔ چاہے ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے بوجھتے ہوں اور نہ راہِ راست پر ہوں۔

اسی حقیقت کو سورہ مائدہ میں یوں بیان فرمایا:

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۤؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۔ (۱۰۴)

کیا اس حال میں بھی یہ تقلید پہ جمے رہیں گے۔ جب کہ ان کے باپ دادا نہ تو کسی چیز کا علم رکھتے ہوں اور نہ صحیح راستہ ہی پر ہوں۔

بیکن نے ماحول اور ماضی کی تقلید کے علاوہ جس چیز کو فکر و تعقل کی زبردست زنجیر قرار دیا، وہ وہ غلط الفاظ اور محاورات ہیں، جو غلط مفروضوں پر مبنی ہوں۔ اس سے بیکن کا یہ مطلب ہے کہ فکر و نظر کی کجی کا باعث صرف غلط دلائل ہی نہیں، الفاظ و محاورات کی غلطی بھی استدلال کی کجی کا باعث ہوتی ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ وہ فکر و تعقل کی اس کمزوری کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ بت پرستوں سے خطاب کرتے ہوتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم جن اللہ کی تقدیس و کبریائی کے قائل ہو خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض الفاظ، نام اور فرضی صفات ہیں جن کی تم پرستش کر رہے ہو دیکھیے سورۂ یوسف کی یہ آیت:

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ - (۴۰)

تم اللہ کے سوا جن آلہہ کی پوجا کرتے ہو، وہ صرف اسماء ہیں جن کو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے گھڑ رکھا ہے۔

## آخری بحث طلب موڑ۔ کیا قرآن استقرا کی تلقین کرتا ہے۔

یہاں تک بحث و نظر جن نکات سے عہدہ برآ ہو چکی ہے، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس عالم کے بارے میں قرآن فکر و نظر کے جس انداز کی حوصلہ افزائی کرتا ہے وہ قطعی استقرائی اور سائنسی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ آخری بحث طلب موڑ یہ ہے کہ آیا اس فکر و نظر کا محور، کلیات میں پہلے سے ڈھلے ڈھلائے مفروضات اور مقدمات عامہ ہیں۔ یا یہ امر ہے کہ تم کائنات کے ہر ہر ظہور اور جزئیہ پر اعتبار و استدلال کی نظر ڈالو، اور دیکھو کہ ان میں ایک ایک ظہور اللہ تعالیٰ کی توحید اور وجود پر دلالت کناں ہے یا نہیں۔

زندگی اور کائنات کا تجزیہ کیجیے۔ انفس و آفاق کے دو ہی خانوں میں۔ ساری حقیقت سمٹی ہوئی نظر آئے گی اور ان دونوں خانوں کے بارے میں۔ قرآن نے بہ کرّات و مرّات واضح لفظوں میں دعوتِ فکر دی ہے۔

اس سلسلہ میں سورۂ ذاریات کی یہ جامع آیت دیکھیے جس میں انفس و آفاق دونو کو فکر و تدبّر کا ہدف قرار دیا گیا ہے:

وفی الارض ایات للموقنین وفی انفسکم ط افلا تبصرون ہ (۲۱)

اور زمین میں اور خود تمھارے قلب و روح میں یقین سے بہرہ مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ کیا تم دیکھتے بوجھتے نہیں۔

اور پھر سورۂ غاشیہ کی مندرجہ تحت آیات پر غور کیجیے، جن میں مظاہر فطرت کو فکر و تدبّر کا خصوصیت سے محور ٹھہرایا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کائنات کے بارے میں جس منطق کو مفید سمجھتا ہے، وہ استقرائی ہے، تخریجی، یا صوری منطق نہیں۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت - والی السماء کیف رفعت - والی الجبال کیف نصبت - والی الارض کیف سطحت - (۲۰)

اور کیا یہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیونکر بنایا گیا۔ اور آسمانوں پر غور نہیں کرتے کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں پر نظر نہیں ڈالتے کس طرح انھیں نصب کیا گیا۔ اور زمین کے بارے میں نہیں سوچتے کس انداز

سے اس کو پاؤں تلے بچھا دیا گیا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ استخراجی منطق سے مسلمانوں نے کوئی کام نہیں لیا۔ جہاں تک عقائد اور علم الکلام کا تعلق ہے مسلمان متکلمین اسی اسلوب تحقیق و تفحص کے پیرو نظر آتے ہیں جس کی معلم اول ارسطو نے طرح ڈالی تھی۔ قدما میں استخراجی طرزِ استدلال اس طرح فکر و تدبر کے دھاروں میں گھل مل گیا کہ اسے فقہ، اصولِ فقہ، حتیٰ کہ نحو کے قواعد کی تشریح و اثبات تک میں آزمایا اور برتا گیا۔ عملاً استقرائی منطق کو استعمال کرنے کی ضرورت کا احساس اس وقت ہوا جب مسلمان حکما کی نادرہ کاریوں نے طبیعیات کو موضوع بحث بنایا اور فلکیات، علم البصر والنور اور طب و تشریح میں حیرت انگیز ترقی کی۔ جب ابو معشر، ابن الہیثم، ابن سینا، رازی، اور زہراوی نے علوم و فنون کی دنیا میں اپنی قابلیت و ابتکار کا لوہا منوا لیا اور ایسے حقائق کی نشان دہی کی جو آگے چل کر موجودہ تہذیب و ثقافت کے ارتقا کا باعث بنے۔

یہ علمی ناانصافی ہو گی اگر ہم اس مرحلہ پہ دو باتوں کا صاف صاف اعتراف نہ کریں۔ ایک یہ کہ پہلے پہل گو قرآن حکیم ہی نے منطق استقرائی کے اسلوب و انداز کی طرف توجہ دلائی اور اس کے خدوخال اور لوازم کو اچھی طرح نکھارا اور عملاً مسلمانوں نے طبیعیات کے دائروں میں اسے برت کر بھی دکھایا۔ تاہم فن کی حیثیت سے قرآن کے اس اندازِ فکر کی تکمیل کا سہرا بیکن اور مل کے سر ہے۔ مغرب کے یہ عبقری ہیں، جنھوں نے ہزار سالہ فکری غلامی سے انسان کو نجات دلائی اور تحقیق و تفحص کی ان راہوں کو متعین کیا، جن سے منطق استقرائی کی افادیت واضح ہوتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے استقرا کو ظن و تخمین کی تاریکیوں سے نکال کر یقین و اذعان کی روشنی عطا کی یعنی اس کو نتیجہ خیز اور مثمر بنانے کے لیے اصول و ضوابط کی تدوین کی۔

دوسرے یہ کہ قرآن حکیم نے استقرا کے جس منہاج کی طرف توجہ دلائی، اس کا اولین تعلق غور و فکر کی ان کیفیتوں سے ہے جو ہر ہر انسان کے دل میں وجود باری کے نقش کو اُجاگر کریں جو توحید کے تصور و عقیدہ کو نکھاریں اور اُخروی زندگی کے بارے میں یقین و اذعان کے داعیوں کو پیدا کریں۔ طبیعی علوم و فنون میں اس کے تعلق کی نوعیت ثانوی اور ضمنی ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کے نزول کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ خلق اللہ کو اللہ کی طرف بلایا جائے۔ ان کی اخلاقی و

روحانی اصلاح کی جائے اور انھیں اس حیات افروز حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ اس چند روزہ زندگی کے بعد، زندگی کے اس روشن اور مکمل دور کا آغاز ہونے والا ہے، جس کی ترقیات کا دارومدار کردار و عمل اور ایمان و اذعان کی استواریوں پر ہے۔ چنانچہ قرآن کے دائرۂ فکر میں یہ بات ہرگز شامل نہیں کہ وہ کسی فن کے متعلق فن کی حیثیت سے گفتگو کرے۔ اس کا اصل موضوع اصلاح، تزکیہ اور تحلیہ ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کے باوجود اس کتاب ہدیٰ میں تمام مفید اور صحیح و درست علوم و فنون کی بنیادوں کا پتہ چلتا ہے تو یہ اس کا اعجاز ہے۔ اور یہ اعجاز اس لیے ہے کہ یہ کتاب اس علیم و خبیر ہستی کی طرف سے ہے جس سے دنیا و مافیہا کی کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں۔ جس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس میں نظم و قاعدہ کی جملہ رعایتیں ودیعت کیں۔

---

# اساسیاتِ اسلام

از مولانا محمد حنیف ندوی

اس دورِ تشکیک میں عالمِ اسلامی کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ معارتقا کی روشنی میں کیونکر از سرِ نو مربوط اور استوار فکر کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مولانا کی یہ کاوشِ علمی اسی اہم مسئلہ کے حل و کشود کو بہ احسن وجہ پورا کرتی ہے۔ اس میں اثباتِ باری، اسلام کے نظامِ حیات، ایمان بالآخرۃ اور اسلام کے اخلاقی نظام کے بارے میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی پردہ کشائی بھی کی گئی ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا مفہوم کیا ہے۔ نظامِ حکومت کے متعلق اسلام کس نظریے کا حامل ہے اور یہ کہ تقسیمِ دولت کے بارے میں اسلام کا تصورِ عدل کس اقتصادی ڈھانچے کا مقتضی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں مذہب، فلسفہ، تصوف اور سائنس کے حقائق کو کامیابی کے ساتھ سمو کر بیان کیا ہے جس سے کتاب کی دلکشی اور معنویت میں بدرجہ غایت اضافہ ہوا ہے۔ اسلوبِ بیان غیر معذرت خواہانہ، علمی اور شگفتہ ہے۔

قیمت: دس روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور